مجید امجد۔۔۔دھرتی کا شناور

غلام فرید حسینی

ABSTRACT:

Urdu poetry before Maulana Altaf Hussain Hali's "Muqadma Sher o shairy" traditionally was known by its sterio-type rules. Hali and Azad encouraged the new ideas to expand urdu language and in general and poetry and particular. Accordingly new apporach of criticism recognized Nazir Akber Abadi. Majeed Amjad accepted the new parameters of peotry and painted all creatures and objects of nature in his poetry. Civilizations consist not only of human being but all the lives and material of soil. He gave the importance not only to the drpressed people of society but animals i.e sheep, cow, sparrow etc.This article is an attempt to explore the aspect of Majeed's poetry which potray the caricature of culture and civilization.

افلاطون" فیڈرس" (Phaedrus) میں لکھتا ہے:

> " جنون کی تیسری قسم وہ ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کے سر پر جنون کی مقدس دوشیزاؤں کا سایہ ہو۔ یہ جنون کسی لطیف اور منزہ روح میں حلول کر جاتا ہے اور اس روح کے اندر ایک خروش پیدا کر کے اس سے غنائیہ کلام تخلیق کراتا ہے جس میں قدیم زمانوں کے شجاؤں کے کارنامے آئندہ نسلوں کی ہدایت کے لیے بیان کیے جاتے ہیں۔(۱)

فن کی مقدس دوشیزاؤں کا سائے والا دعویٰ شاعروں کے سودائی ہونے سے پایہ ثبوت کا پہنچ جاتا ہے۔شعر نری تخیل کی پیداوار ہوتا تو مندرجہ بالا نظریے سے اختلاف کی گنجائش تھی مگر تخیل میں وجدان کی آمیزش سے یہ عقدہ کھلا کہ غنایت ہر کس و ناکس کے ہاں نہیں پائی جاتی۔ضرور کوئی منزہ روحیں ہیں جن کے سر میں یہ جنون حلول کرتا ہے۔ یہ جوہر فن کار میں بیج کے زمین میں ہونے کے سمان موجود ہوتا ہے اور کلام تخیل سے یوں جز میں کل کو منقش

کرتا ہے جیسے فطرت پھول میں خدا اور پوری کائنات کی نیرنگی کو۔فن مقصدیت سے ماوراء ہوتا ہے اس کا اولین نصب العین جمالیات کا پرچار ہے۔ جمالیات تہذیب کی ایک قدر ہے۔ شاعر معاشرے میں ،کمہار، کسان، لوہار، سنگ تراش، مجسمہ ساز، ترکھان وغیرہ کی طرح ایک کردار ہے جو کلچر کی بوقلمونیوں سے تہذیب کو آراستہ کرتے ہیں۔ رگ وید کے حوالے سے زبیر رانا نے لکھا ہے :

" شاعر نے ایسے خوبصورت گیت بنائے جیسے ترکھان نے رتھ بنایا۔"(۲)

دنیا کی سب قدیم تہذیبوں میں شاعروں اور ان کے نغموں کی غنائیت ایک ابدی حقیقت ہے۔ ہومر، امراء القیس ، فردوسی، شیکسپیئر، گوئٹے، غالب، اقبال وغیرہ اپنی اپنی تہذیبوں کے نمائندہ ہیں جن کا نام آتے ہی تہذیبیں اپنی پھبن کے ساتھ سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں اور ان کے فن پارے تہذیبی مرقعے نظر آتے ہیں۔

"واقعات اور کرداروں کے ہجوم کے ساتھ یہ ایپک (رگ وید) ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی جمالیات کا ایک درخشندہ ستارہ بن گیا ہے۔"(۳)

جس طرح جڑوں سے جڑت کے بنا کوئی شجر پھل پھول نہیں سکتا اسی طرح دھرتی سے کٹ کر کوئی شاعر جاودانی مقام سے محروم رہتا ہے ۔ جمالیات میں روح کی تسکین اور نفس کی تہذیب اہمیت کے حامل ہیں۔ روح اور نفس دونوں کے تقاضے فن کی بالیدگی سے پورے ہوتے ہیں۔ شاعر جب تک دھرتی سے جڑ کر تہذیبی شے نہیں بن جاتا تب تک وہ اپنے تجربے کو بیان نہیں کرسکتا۔ وزیر آغا کا یہ شعر شاید مدعا کو واضح کر سکے :

کوزوں کے ساتھ ہم بھی تھے بکھرے پڑے وہاں
اس شہر بے مثال کے آثار ہم بھی تھے

فارسی شاعری میں جس شے کا ذکر مقصود ہو اس کو کسی اور چیز سے مشابہہ قرار دیتے ہیں محبوب کی نزاکت کو پھول سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چاند سے معشوق کا چہرہ مراد لیا جاتا ہے۔ اردو چونکہ فارسی شاعری کا تتبع بلکہ نقالی ہے اس لیے بعینہ وہی مبالغہ ، صنائع بدائع اور رعایت لفظی لیے ہوئے ہے۔ جدید نظم کی تحریک کا ایک مقصد شاید زمین سے جڑت بھی تھا۔ صوفیاء اور بھگت جو تہذیبی ورثے کے وارث تھے ان کی بھاشا میں سادگی اور سلاست ہے جو تہذیب سے وابستگی کی علامت ہے۔ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن لکھتے ہیں:

" محمد حسین آزاد کے بیان کردہ اردو بھاشا زبان کے فرق والے ایک نقطے میں پوشیدہ ہے۔ آزاد نے فارسی اور اردو کی انشاء پردازی کی دشواری اور اسکے مقابلے میں ہندی کی آسانی کا بنیادی سبب یہ بتایا ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے وہ اس کا نقشہ ایسے توضیحی لفظوں میں کھینچتی ہے گویا ہم اس شے کو اپنے حواس سے براہ راست محسوس کر رہے ہیں۔" (۴)

اسی لیے ایک مدت تک نظیر کو کسی خاطر میں نہیں لایا گیا مگر جب Post Colonial تاریخی شعور ظہور میں آیا تو وہی نظیر ، کبیر کا جانشین ٹھہرایا گیا۔ ایس ڈبلیو فیلن اور رام بابو سکسینہ نے نظیر کو شاعروں کی صف میں جگہ دی۔ مگر عقیدوں اور نظریات کے بتوں کی مانند شاعری کے Parameters بھی اتنے جلد بدلنے والے نہیں۔ حالی

اور آزاد کی مساعی کی بدولت بہت سے شعراء تقلید سے منحرف ہوئے اور اپنے لیے نئی راہیں متعین کیں مگر نظیر، کبیر، بھگتی شعراء کا سا رنگ اختیار کرنے والے ادبی کٹھالی میں Misfit ٹھہرے۔ اسی قبیل کا ایک شاعر مجید امجد نام کا بھی ہے جس نے دھرتی کے ان اجزاء کو شاعری میں سمویا جو دھرتی کا تو حسن ہیں مگر ادبی معیار پر وہ تمام اشیاء نیچ اور پست ہیں۔ ناصر عباس نیر کے بقول:

"ان (نظموں طلوعِ فرض، پنواڑی، بن کی چڑیا، جاروب کش، پکار، ہڑپے کا کتبہ، توسیع شہر، سفرِ درد ہوٹل میں، ایکسڈینٹ، گوشت کی چادر وغیرہ) میں ظاہر ہونے والی اشیاء مخلوقات، عام اور معمولی ہیں۔ جنہیں عام طور پر شاعری کا موضوع نہیں بنایا گیا۔ اور اس لیے نہیں بنایا گیا کہ روایت طور پر شاعر کا پرعظمت تصور نالی کے گندے پانی، پان لگانے والے معمولی آدمی، حقیر چڑیا اور لالی، بھیڑ جیسی عام مخلوق درخت، بوجھ کھینچنے والا گھوڑا، بیل، کسان اور ہر روز ہماری طشت میں سجنے والے مرغ کو شاعری کا موضوع تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں ہے۔"(۵)

بھلا ہو ڈاکٹر محمد ذکریا کا جنہوں نے مجید امجد کی طرف نظر التفات کی اور یوں تہذیب آشنا شاعر سے اردو داں طبقہ شناسا ہوا۔ مٹی سے انمٹ رشتہ رکھنے والے دو فنکار (جناب احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا) بھی مجید شناسی میں ہمارے محسن ہیں۔ فی زمانہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی مساعی جمیلہ سے مجید امجد کے فن و شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جامعات میں ہونے والی تحقیق اس پر مستزاد ہے۔ مگر ہنوز تہذیبی بحران اور روایات کی زوال پذیری کے اس دور میں مجید امجد کا فن اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر مزید کام کیا جائے۔

تقسیم میں فقط افراد تقسیم نہیں ہوئے بلکہ فکر کے زاویے تک بدل گئے ہیں کولونیلزم کے عفریت تہذیب کو نگلنے کے بعد سوچوں پر بھی پہرے بٹھا گیا ہے۔ دھرتی، تہذیب، روایات کا نام لینے والے بھی اجنبی سمجھے جانے لگے۔ مجید امجد ایک جینوئین فنکار تھا جو ادبی گروہ بندیوں وغیرہ سے کوسوں دور تھا وہ صرف فن کو تخلیق کرتا رہا اس کے عوض وہ کسی بھی ستائش یا طمع کا طالب نہ ہوا:

"اس دنیا میں دھن والوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہر دیالو کے دامن سے کوئی نہ کوئی میلی کچیلی غرض ضرور بندھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے ایک ہاتھ سے غرض مند کے کشکول میں کچھ ڈالتا ہے جبکہ اس کا دوسرا ہاتھ خود ایک کشکول بنا اپنے اس نیک عمل کے عوض شہرت، دولت، اولاد یا جنت کی بھیک مانگ رہا ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی اس دنیا میں ایسے لوگ بھی آ جاتے ہیں جن کا صرف دایاں ہاتھ ہی متحرک ہوتا ہے جبکہ ان کا بایاں ہاتھ سرہانے پڑا سویا رہتا ہے۔ ایسے لوگوں میں پیغمبر، اولیا اور تخلیق کار شامل ہیں۔"(۶)

ایسے تخلیق کار آنے والی نسلوں کے لیے ادب تخلیق کرتے ہیں۔ وہ تہذیب کے حسن کو اپنے قارئین پر واضح کر کے اس سے انسیت و محبت کے رشتے استوار کرنے کا سامان کرتے ہیں۔ تہذیب سے لاتعلقی یا دوری ایک قسم کی نادانی ہے جس کے بعد انسان اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے وہ عقل کی بجائے جذبات اور پراپیگنڈے

سے ہدایات لیتا ہے۔عقل کا دامن چھوڑنا جہالت کی نشانی ہے۔ ہیجان آمیز تحریکیں، جذباتی ،نعرے ازل سے تعمیر کی بجائے تخریب کا سبب بنتے آئے ہیں۔جس سے ہمیشہ تہذیب نے زخم کھائے ہیں:

"تہذیب زندگی کو ہر پہلو سے دیکھنے کی راہ بتاتی ہے اور جہالت انسان کی نظر کے سامنے ہر طرف سے پردے لٹکا دیتی ہے۔ یہ پردے خواہ کسی بہانے سے آپ کے سامنے لٹکائے جائیں۔آپکی عقل کا کام انہیں ہٹانا ہے تا کہ آپکی آنکھیں اس روشنی تک پہنچ سکیں جس کا نام تہذیب ہے۔"(۷)

مجید امجد اپنی تہذیب کے کل سے واقف ہے اس لیے ان کے ہاں معمولی چیزیں بھی روشن استعارے بن کر اجاگر ہوتی ہیں۔شالاط ایک جرمن لڑکی ہے جو پاکستان (جھنگ / ساہیوال) سمیت کئی ملکوں کی سیر کے بعد واپس جاتی ہے تو ماں سے ملتی ہے اور اپنے ساتھ لائی چیزوں کا بیان کرتی ہے:

"دس برس کے طویل عرصے کے بعد
آج وہ اپنے ساتھ کیا لائی؟
روح میں دیس دیس کے موسم!
بزم دوراں سے کیا ملا اس کو
سیپ کی چوڑیاں ، ملایا سے
کینچلی چین کے اژدر کی
ٹھیکری اک موہن جو داڑو کی" (میونخ۔۔۔کلیات مجید امجد)

گزرے زمانوں کی ٹھیکری عظمت رفتہ کا وہ نگینہ ہے جو اس دھرتی کے ہر شودر اور کمی کے تاج کا کوہ نور ہے۔ یہی وہ تہذیبی شعور ہے جو ان کی شاعری کا وصف ہے۔ وہ خود اس دھرتی کی مٹی سے اپنی جڑت پر نازاں ہیں۔اسی نظم کے اگلے شعر میں وہ موہن جو داڑو کی ٹھیکری کے بعد اپنا ذکر کرتے ہیں:

"ایک نازک بیاض پر،مرا نام
کون سمجھے گا،اس پہیلی کو؟" (میونخ۔۔۔کلیات مجید امجد)

ٹھیکری دراوڑی تہذیب کی علامت ہے۔ شالاط نے مشرق بعید سے چین سے بھی ان تہذیبوں کی دود علامتیں بطور تحفہ لی ہیں ۔ ہندوستان سے ٹھیکری اور مجید امجد کا نام دو چیزیں ساتھ لے گئی ہے۔اپنی ذات کو تہذیبی ورثے کے ساتھ جوڑنا بھی معنی خیز ہے۔مجید امجد کی شاعری تہہ دار ہے جس میں پرت در پرت معانی پوشیدہ ہیں ۔ سامراج کے ہتھکنڈوں میں ایک مادی ترقی اور سائنسی ایجادات کا برصغیر میں متعارف کروانا بھی تھا۔اس تیر سے کئی شکار کر لیے گئی۔ باغوں اور پھولوں کی قیمت پر سڑکیں تعمیر ہوئیں تو گویا تہذیب کا ایک عضو کاٹ دیا گیا۔اس ترقی کو خوش آمدید کہنے والے اپنے نقصان سے بے بہرہ رہے:

" صبح کو ہم اپنے کاموں پر جاتے ،تو سب سڑک کے موڑ پر

تازہ دم پھولوں کے رنگ برنگے تختے ہم سے کہتے
کرنوں کا یہ دھن سب کا ہے، سب کا، اس میں
جیو، جیو، سب مل کر، سنگت سے ہے رنگت،
پھر جب دن کی روشنیاں تھکتیں
تو اس موڑ پر نیندیں اوڑھ کے سہمے ہوئے پھول ہم سے کہتے
سب کا بیری ہے یہ اندھیرا۔۔۔
لیکن اب وہ تختے اجڑ گئے اور اب اس کوٹھی کے دروازے پر چکنی بجری ہے
اور تھرکتے چمکیلے پہیے ہیں۔۔۔" (دروازے کا پھول۔۔۔کلیات مجید امجد)

پھول روشنی اور بھائی چارہ کلچر کی دلیلیں ہیں۔ بجری، تارکول اور کاریں اور اندھیرا تہذیب سے اجنبیت کا ثمرہ ہیں۔ مادی ترقی کالونیل، شعور کے مطابق Civilized ہونے کی نشانی ہے اب فنکار نے شعور کو De-colonialize کرنا ہے اور پھر فرد اس قابل ہوگا کہ وہ تہذیب گم گشتہ سے ناطہ جوڑے۔ مجید امجد کا زمانہ اتنا دور کا نہیں ہے اس وقت تک تہذیب کے چند نقوش ابھی زندہ تھے۔ ہل، بیل، پنجالی، درانتی، ریڑھا، تانگا وغیرہ۔۔مگر اب اشیا بھی ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ تانگہ ہمارے تہذیبی ورثے کی ایک خوبصورت نشانی ہے اور ادب میں بھی مشرقیت کی علامت کے تناظر میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً منٹو کا نیا قانون والا کوچوان۔ مجید امجد نے بھی اس ثقافتی ورثے کو یوں برتا ہے کہ آنے والے زمانے جب تاریخی شعور کی روشنی میں تہذیب کی بازیافت کریں گے تو تانگہ اور کوچوان توانا عنصر کے طور پر موجود ہوں گے۔

"میں پیدل تھا، میرے قریب آ کے اس نے، بہ پاس ادب، اپنے تانگے کو روکا
۔۔۔تو میں نے سنا کہ ایک خاکستری نرم لہجے میں، مجھ سے کوئی کہہ رہا تھا،
چلیں گے کہیں آپ؟ بازار، منڈی، سٹیشن، کچہری!
پلٹ کر جو دیکھا تو تانگے میں کوئی سواری نہیں تھی، فقط
اک فرشتہ، پھٹے کپڑے پہنے
عنانِ دو عالم کو تھامے ہوئے تھا" (جلوسِ جہاں۔۔۔کلیات مجید امجد)

فنی حوالے سے نظم کا یہ ٹکڑا ایک نمونہ ہے ہی جس میں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب سے مخاطب ہے۔ جہانِ معانی پر غور کریں تو تخیل کی پرواز میں مٹی وہ بو باس اور نرمی کہ جس میں کوچوان فرشتہ کے روپ میں ہے اور گھوڑے کی باگیں دو جہانوں کی ڈوریاں ہیں۔ یہ روش اردو نظم میں تو کم از کم اس سے قبل عنقا ہے۔ ماضی کے یہی اصلی ہیرو تھے جن پر نہ اس وقت کی مقتدرہ مہربان ہوئی نہ مورخ نے نظرِ التفات کی اور نہ ہی ادب میں ایسی نیچ چیزیں اپنی جگہ بنا سکیں۔ مجید کی نظم شکستہ اور مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے۔ مجید دیہات سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے اپنے ماحول کو کبھی چھوڑا نہیں۔ دیہی زندگی برصغیر کی ستر فیصد آبادی پر محیط ہے۔ اس کی شاید ایک

وجہ یہ بھی ہے کہ دیہاتی اپنی روایات سے جڑت مضبوط رکھتا ہے:

" دیہی طبقہ اپنے اعتقادات، رسوم و رواج اور اقدار و معیار سے بڑی حد تک وابستہ رہتا ہے
اس میں فکری وتصوری تبدیلیاں بے حد سست رفتار ہوتی ہیں کیونکہ اس کی بنیادی ہیت میں
تبدیلی کے تیز رفتار امکانات نہیں ہوتے ہیں۔" (۸)

مشرقی تہذیب کے ان شعروں میں ہمیں اپنی چھب دکھلاتی ہے۔ وہ اپنی فکر و دانش سے اس روایت سے ہمیں روشناس کرواتے ہیں جن کا سلسلہ امیر خسرو سے ہوتا ہوا بھگت کبیر اور صوفیاء کی تعلیمات تک جاتا ہے۔ جن کا پیغام آویزش اور ٹکراؤ نہیں امتزاج اور گھال میل ہے۔ مجید امجد خود اس تہذیبی روایت کی زندہ مثال تھے۔:

"سردار تخت سنگھ بھی مجید امجد کے احباب میں شامل تھے جو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک گاؤں میں
مدرس تھے۔ مجید امجد نظم کے اس قابل ذکر شاعر سے ملنے اکثر جاتے تھے۔ ان کی نظم " کنواں"
تخت سنگھ کے گاؤں کی یادگار ہے۔"(۹)

کائنات کے ذرے (Atom) میں جس طرح پوری کائنات کا کل موجود ہے اسی طرح مجید امجد کے ہر فن پارے میں معمولی چیزوں کا ذکر ملتا ہے اور یوں ایک حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی بھی چیز بے فائدہ و بے مصرف نہیں ہے یہ چیزیں مجید کی نظموں میں پہنچ کر معتبر لگنے لگتی ہیں ملاحظہ ہوں چند لائنیں:

"یہ چٹیل سے میدان یہ ریتوں کے ٹیلے
ہیں جن پر بچھے دوب کے زرد تیلے
یہ کپاس کے کھیتوں کی بہاریں
چہ ڈوڈوں کی چنتی ہوئی گلغداریں
یہ چھوٹی سی بستی یہ ہل اور ہالی
یہ صحرا میں آوارہ، بھیڑوں کے پالی
یہ حیران بچے یہ خاموش مائیں
یہ گوبر کی چھینٹوں سے لتھڑی قبائیں
یہ اینٹوں کا آوا، یہ اونٹوں کی ڈاریں
یہ کیکر کے پیڑوں کی لمبی قطاریں
یہ لہروں میں بہتا ہوا مست پانی
یہ گنوں کی رت کی سنہری جوانی
یہ اینٹوں کا آوا، یہ اونٹوں کی ڈاریں
یہ کیکر کے پیڑوں کی لمبی قطاریں
درختوں کے سایوں سے آباد رستے

یہ آزاد راہی، یہ آزاد رستے" (ریل کا سفر۔۔۔کلیات مجید امجد)

غالبًا اسی لیے وزیر آغا نے کہا تھا:

"یہ درد مندی کا جذبہ ہے جو اپنی ساری گہرائی اور تنوع کے ساتھ ابھرا ہے اور اس نے جمادات، حیوانات، حشرات الارض، پھل پھول اور بچوں کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیا ہے۔"(۱۰)

ان کے ہاں غیر انسانی کردار مثلاً جانور، درخت، پرندے وغیرہ بھی مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے مجید امجد کے اس رویے کو قدیم اساطیری انسان کے مشابہہ قرار دیا ہے جب یہ اشیاء بھی افراد کی مانند سمجھی جاتی تھیں۔ کسان اپنے بیلوں، گڈریا اپنی بھیڑوں اور کوچوان اپنے گھوڑے سے باتیں کرتے تھے۔ مانجھی دریا سے ہم کلام ہوتا تھا۔ فطرت کے عناصر سے سنگت میں جب تک کھنڈت نہ پڑی تھی یہ سب ممکن تھا۔ صنعتی انقلاب نے جہاں انسانی رشتوں کو پامال کر دیا وہاں یہ عناصرِ فطرت کس کھیت کی مولی تھے۔ وزیر آغا نے کہا تھا کہ درخت کی بے ریائی، دستگیری اور خاموشی سے دکھ سہنے والے اوصاف کی وجہ سے مجید نے ان کو اپنی نظموں میں بہت برتا ہے اس میں اگر زمین سے پیوستگی کا اضافہ کر دیا جائے تو درخت کے تہذیب کا استعارہ بن جاتا ہے۔ چند ٹکوں کی خاطر اپنی تہذیب و روایات کا سودا کرنے والے ریاکار مجید کا ہدف ہیں ان کو پہچاننے میں وہ نئی نسل کی مدد کر رہے ہیں۔ خود کش حملہ آور بھی ہمارا مسئلہ ہیں مگر جنگلوں، چراگاہوں، باغوں کا خاتمہ بھی کچھ کم مہلک خطرہ نہیں ہے۔ جنگلی حیات تو شاید ہمیں اب چند چڑیا گھروں میں نظر آئے گی:

" مجید امجد تاریخ وتہذیب کا اچھا نباض ہے۔۔۔اس نے ظلم اور دکھ کو پوری انسانی تاریخ میں کروٹیں لیتے ہوئے پایا ہے لہذا اس کی دردمندی کی رو بھی قرنوں کو عبور کرتی چلی گئی ہے

بہتی راوی تیرے تٹ پر کھیت اور پھول اور پھل
پانچ ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کے چھل بل
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی اک ہالی اک ہل"(۱۱)

مظلوموں اور دکھیاروں کے دکھوں کا مداوا نہ تو کسی ازم نے کیا ہے نہ ہی کوئی نظریے کا ہنڈیا بھوکوں کو کھانا کھلا سکی۔ ازل سے استحصالی طبقات روپ بدل بدل کر اپنے کھیل کھیلتے آ رہے ہیں۔ سامراج کے بوئے ہوئے نفرتوں اور ظلمتوں کے بیج وطن عزیز میں سامراجیوں مالیوں اور باغبانوں کی بدولت تن آور درخت کا روپ دھار چکے ہیں۔ غریبوں کی قسمتوں کے فیصلے بونے سرانجام دے رہے ہیں۔ دستارِ فضیلت ان کو ملی ہے جن کے سر ہی نہیں ہیں۔ مجید امجد نے اس حقیقت کو اپنی نظم میں " کہانی ایک ملک کی" میں بیان کیا ہے۔:

" راج محل کے اندر اک اک رتناسن پر
کوڑھی جسم اور نوری جامے
روگی ذہن اور گردوں کے پیچ عمامے

جہل بھرے علامے
ماجھے گامے
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ پر شہد، اور جیب میں چاقو
نسل ہلاکو!" (کہاں ایک ملک کی۔۔۔کلیات مجید امجد)

احمد ندیم قاسمی نے مجید امجد کے بارے میں کہا تھا کہ

"وہ عمر بھر انسان کے دکھوں اور سوچوں کو زبان دیتا رہا" (۱۲)

ہلاکو کی نسل نے عوام سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی ہے اور لکھاریوں کی فرشتہ نما ٹیمیں ہیں جو مسلسل پراپیگنڈے کا ڈھول پیٹ کر وہ دھول چھ دہائیوں سے اڑا رہے ہیں کہ مجید امجد جیسے ادیبوں کو پہنچانا بھی دشوار ہے:

"مالک آج اس دیس میں
اس بستی میں اگر کوئی دیکھے تو
ہر سو بھری بہاروں، فصلوں، کھلیانوں پہ پھیلی دھوپ کی تہہ کے تلے اک
۔۔۔۔جگہ جگہ پر
بکھری ہوئی نورانی قبریں
آنگن آنگن روشن قدریں
مائیں۔۔۔۔جن کے لال، مقدس مٹی
بہنیں۔۔۔۔جن کے ویر۔۔۔منور یادیں
بالک جن کی مایا۔۔۔بے سدھ آنسو" (چہرہ مسعود۔۔۔کلیات مجید امجد)

تہذیب کی بہاروں کو ہلاکو نسل نے خون آلود کر دیا ہے۔ قیصریت مجید امجد کی ایک ایسی نظم ہے جو نہ صرف برصغیر کے مظلوموں بلکہ دنیا بھر کے ناداروں کے دل کی آواز ہے۔ دھرتی پر جانیں نچھاور کرنے والے، بے یارو مدد گار لواحقین اور یتیم وقت کا جبر باپ کو میدان جنگ کا ایندھن بناتا ہے اور ماں پہاڑ جیسی زندگی کے لیے نیا جیون ساتھی تلاش کر لیتی ہے۔ مگر یتیم بچہ جو اب ریاست کی ذمہ داری بن چکا تھا خود ریاست کے ظلِ سبحانی کے بھاری پروٹوکول تلے کچلا جاتا ہے:

"پھر بھی رعایا: دی رعایا نے دعا ہر سمت سے۔ بادشاہ مہربان! زندہ رہے"

(قیصریت۔۔۔کلیات مجید امجد)

اور ان تمام دکھوں پر کسی کو ملال بھی نہیں۔ مجید امجد کے ہاں یہی احساس مختلف صورتوں میں اجاگر ہوتا رہتا

ہے اور عوام کی ظلم چپ چاپ سہتے رہنے کو خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔

Non-Resistance کا رویہ بنیادی طور پر شاید اہنسا کی تعلیمات ہیں جس میں دھوکا کھانا نیکی اور دھوکا دینا جرم تھا۔

" کبرا آپ ٹھگائیے اور نہ ٹھیگے کوئی
آپ ٹھگا سکھ ہوت ہے اور ٹھگا دکھ ہوے " (۱۳)

یہ امن پسندی تھی یا جرمِ ضعیفی کہ آریوں سے انگریزوں تک ظالموں کے تھپڑ کھانے پر اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دیا جاتا رہا۔ اور ظالم بھی ایسے بے شرم کہ جنہوں نے دھرتی کے اصل باشندوں کی شناخت تک مٹا ڈالی اور ہزاروں سالہ خون سے سینچا گیا تہذیب کا درخت نفاق اور نفرت کے کلہاڑے سے آن کی آن میں کاٹ ڈالا۔ ادب سے کسی بھی قوم کا ذوق جانچا جاتا ہے بقول گستاؤلی بان:

" اگرچہ کسی قوم کے دماغی خصائص کا پتہ اس کی کل تصانیف سے لگتا ہے لیکن زیادہ تر اس قوم کی کتب ادب سے۔"(۱۴)

اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ کم وقت میں اسے ایسے ادیب میسر آئے جنہوں نے بہت جلد اس کی ادبی حیثیت کو چار چاند لگا دیے۔ مجید امجد میں شعر کہنے کا ملکہ قدرت کا ودیعت کردہ تھا اور وہ خود اس بات سے آگاہ بھی تھے۔خواجہ محمد زکریا ان کے کلیات کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

" امجد کے لیے شعر گوئی کو دان کے بقول ایسی تھی جیسے دریا کے لیے بہنا، کوئل کے لیے کوکنا اور ہوا کے لیے چلنا یعنی شاعری ان کی فطرت کا جزو تھی۔" (۱۵)

فطرت کے عطا کردہ عطیہ کو انہوں نے فطرت کی نغمہ خوانی میں خرچ کر دیا۔ موسموں، تہواروں، غریبوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، اوزاروں، کھیت کھلیانوں اور دہقانوں کو شاعری کا موضوع بنا کر ان کو وقیع کر دیا:

" بیسا کھ آیا، آئی فسوں زائیوں کی رت
آئی حسین کلیوں کی برنائیوں کی رت
گاؤں کے مرد و زن نے اٹھائیں درانتیاں
آئی سنہری کھیتوں، لائیوں کی رت
کھیتوں میں دھیمے قہقہوں کا موسم حسیں
رستوں پر گونجتی ہوئی شہنائیوں کی رت " (کلیاتِ مجید امجد)

قافیہ پیمائی کا حسن اور فطرت کی قوس وقزح عجیب خروش کا باعث بنتی ہے۔ گندم کی کٹائی کا موسم کسانوں مزدوروں کے ارمانوں اور خوشیوں کے ثمر آور ہونے کا وقت ہے۔ "لائیوں کی رت" کو سمجھنے کے لیے سرائیکی زبان سے رجوع کرنا پڑے گا۔ فصل کی کٹائی کے لیے روزانہ اجرت (Daily wages) کو لائی کہا جاتا ہے اور مرد و زن غرباء بھی ان موسموں میں قہقہوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ مجید کا فن دھیمے لہجے میں اپنی حیثیت

Establish کرواتا ہے۔ بقول شمیم حنفی ادب اور آرٹ کی دنیا میں گہری باتیں ہمیشہ دھیمے اور مرموز لہجے میں کہیں جاتی ہیں۔ تقسیم کا المیہ اور ہجرت کے رنج ہمیں مجید امجد کے کلام میں نظر آتے ہیں مگر اس میں شور، خطیبانہ انداز نہیں ملتے۔ اپنی دھرتی اپنے ٹھکانے کو چھوڑنا بہت کٹھن ہے بعض نے اس کی قیمت پر دھرم چھوڑ دیے ملاحظہ ہو گھر چھوڑنے کا منظر:

" تجھے ہے یاد؟ یہاں ایک پنچھی رہتا تھا
وہ جس کے نغموں کو رو میں زمانہ بہتا تھا
یہاں سے جانے لگا وہ تو رو کے کہتا تھا
رفیق! جاتا ہوں! پھر جانے کب ہو آنا مرا
تیرے سپرد یہ چھوٹا سا آشیانہ مرا" (یہیں پہ رہنے دے صیاد آشیانہ مرا۔۔۔کلیاتِ مجید امجد)

اتنی قیامتوں کے بعد بھی وہ مایوس نہیں ہیں انہیں امید ہے کہ وہ جانے والا ہمدم وہ تہذیبی رت لازماً واپس آئے گی۔ محبت کے موسم لوٹیں گے۔ صیاد سے دست بستہ التجا کرتا ہے کہ میرا آشیانہ نہ اجاڑ۔ میرا سنگتی ادھر ہی قریب ہے بس وہ آنے والا ہے۔ ہم پھر مل کر رہیں گے:

"وہ دیکھ شاخیں ہلیں۔ وہ آ رہا ہوگا
حسین کلیاں کھلی ہیں۔۔ وہ آ رہا ہوگا
رتیں رتوں سے ملی ہیں۔ وہ آ رہا ہوگا
یہیں ادھر ہی، وہ سکھ سنگتی پرانا مرا
یہیں پہ رہنے صیاد، آشیانہ مرا" (یہیں پہ رہنے دے صیاد آشیانہ مرا۔کلیات مجید امجد)

جن فنکاروں کو مشعلِ راہ ہونا چاہیے تھا انہیں طاقِ نسیاں کی نظر کر دیا گیا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو کو فطری رنگ میں ایسے برتا گیا کہ جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ مجید امجد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بلراج کومل نے لکھا تھا:

" مجید امجد ارضی زندگی کے قریب ہی سے نور اخذ کرتے ہیں۔ وہ ہمارے شہروں، قصبوں اور دیہات سے شب و روز گزرتے ہیں۔ وہ گلیوں، بازاروں گھروں، چھتوں، ممٹیوں، پہاڑوں اور میدانوں اور ان کے درمیان سانس لیتے ہوئے انسانوں کو قریب سے دیکھتے ہیں اور ان کی دھڑکنیں سنتے ہیں۔ ہری بھری فصلوں کے نغمہ ساز ہیں۔" (۱۶)

بلراج کے اس بیان کی صداقت مجید کا پورا کلام ہے۔ انکی کوئی نظم اٹھا کے دیکھ لیں وہ ارضی حقیقت سے خالی نہ ہو گی۔ مندرجہ ذیل عنوانوں سے ہی فطرت سے لگاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے: گاؤں، جھنگ، ریل کا سفر، بیساکھ، گھٹا سے، چچی، کنواں، سوکھا تنہا پتا، دور کے پیڑ، چولہا، پنواڑی، بن کی چڑیا، بارش کے بعد، لاہور میں، کانٹے کلیاں، دھوپ چھاؤں، ایک شام، زندگی رے زندگی، ساجن دیس کو جانا، بہ فرش خاک، جیون دیس، کون

دیس گیو، ہری بھری فصلو، مقبرہ جہانگیر، نرگس، بھکارن، ریوڑ، جاروب کش، شاخِ چنار، عیدالضحیٰ، ریلوے سٹیشن پر، معاشرہ، بھادوں، بہار، صبح کے اجالے میں، متروکہ مکان، صاحب کا فروٹ فارم، ہوٹل میں، پہاڑوں کے بیٹے، بچاسویں پت جھڑ، خطہ پاک، ایک دن ماں نے کہا، آواز کا امرت، پھولوں کی پلٹن، بہار کی چڑیا، اے ری چڑیا، مینا، ننھی بھولی، دیوں کے جلنے سے، گدلے پانی، مورتی، فصلِ گل، دروازے کے پھول، چیونٹیوں کے ان قافلوں، باہراک دریا، باڑیوں میں قید، اے ری صبح۔

مجید امجد امن و آشتی اور دلیل و برہان کی سلطنت کا باسی تھا انہیں اگر شیر افضل جعفری گیان دھیان کا راجہ کہا گیا ہے تو بالکل درست ہے۔"(۱۷)

جمالیاتی ربط ان کے کلام میں مٹی سے جڑت کی بدولت ہے اور ہر شے کا حسن مٹی کی دین ہے اس لیے رسول اللہﷺ نے شیرِ خدا کو بوتراب کا فرمایا تھا جس پر وہ زندگی بھر شاداں رہے۔ ابلیس کا انکار حقیقت میں اس کی کم علمی کی دلیل ہے کہ وہ مٹی کے Essence کو پہچاننے میں ناکام رہا۔ مٹی سے محبت فنکاروں کے پاؤں کی زنجیر ہوتی ہے اس لیے کہ اس کی صداقت سے واقف ہوتا ہے۔ مجید امجد بھی اپنی مٹی اپنی دھرتی کا شناور تھا اسی لیے پوری زندگی وہ اس کا نغمہ خواں رہا:

> "آدمی مٹی ہے، یہ عقیدہ بھی ہے اور سائنسی صداقت بھی، عہد نامہ عتیق سے یہ بات عقیدے کا درجہ رکھتی ہے کہ آدمی کو مٹی سے تخلیق کیا گیا اور سائنسی طور پر بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ آدمی انہیں عناصر سے بنا ہے جن سے مٹی اور دیگر اشیاء بنی ہیں۔"(۱۸)

اس دھرتی کا اصل علم، فن، ادب اور فنونِ لطیفہ تھے۔ اس دھرتی نے ظلم کے بدلے احسان کے چلن کو عام کیا۔ بحرانوں کو برہانوں سے سلجھایا۔ یہی پیغام تھا جو مجید امجد نے آنے والی نسلوں کو اپنی شاعری کے وسیلے سے دیا۔ ان کا پیغام مظلوموں کی پیروی کا درس ہے۔ جنہوں نے معافی، درگزر، اور صبر جیسے الفاظ کو نئے معانی دیے جنہوں نے گھر آئے اپنے بھائیوں کے قاتلوں کی مہمان نوازی کی

"مالک تو ہی ان سے سب شقی جہانوں کے غوغا میں
میں عطا کر
زیرِ لب ترتیلیں ان ناموں کی
جن پر تیرے لبوں کی مہریں ہیں (بستے رہے سب۔۔۔۔کلیات مجید امجد)

اسی لیے وزیر آغا نے پیغمبروں، اولیاء کی صف میں تخلیق کاروں کو بھی شامل کیا ہے۔

حوالہ جات:

(۱) محمد ہادی حسین (مرتب)، مغربی شعریات، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۲
(۲) زبیر رانا، داستانِ ثقافت (جلد اول)، مصباح سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۰۳
(۳) شکیل الرحمان، ہندوستان کا نظامِ جمال (جلد دوم)، قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی ۲۰۰۱ء، ص۲۲۶
(۴) عزیز ابن الحسن، غالب کی نیرنگی اظہار اور اس کی شخصیت، مشمولہ معیار، شمارہ ۹۰، جون ۲۰۱۳ء، ص۲۸۲
(۵) ناصر عباس نیر، مجید امجد، حیات، شعریات اور جمالیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۱۲۲
(۶) وزیر آغا، ڈاکٹر، ساختیات اور سائنس، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۱۹
(۷) حمید اللہ خان، پروفیسر، تعلیم و تہذیب، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص۳۴
(۸) عبدالباری سید ڈاکٹر، لکھنؤ کا شعر و ادب، الفلاح پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۶ء، ص۲۶
(۹) ناصر عباس نیرّ، مجید امجد فن و شخصیت، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء، ص۳۲
(۱۰) ناصر عباس نیر، مجید امجد شخصیت و فن، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸، ص۶۴
(۱۱) وزیر آغا، ڈاکٹر، ساختیات اور سائنس، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۷
(۱۲) امجد سلیم، مضمون "ندیم قاسمی ایک شرر پیراہن خاک میں لپٹا ہوا، مشمولہ دستاویز، شمارہ ۵، جلد دوم، ۱۹۹۱ء، سلیم پبلشرز راولپنڈی، ص۲۵۶
(۱۳) ہری اودھ، (ترجمہ سرسوتی سرن کیف) بھگت کبیر فلسفہ و شاعری، مشتاق بک کارنر، لاہور، سن ندارد، ص۱۲۳
(۱۴) گستاؤلی بان، ڈاکٹر (ترجمہ سید علی بلگرامی)، تمدن ہند، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۴۵۷
(۱۵) مجید امجد، پیش لفظ (ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)، کلیاتِ مجید امجد، ماورا پبلشرز لاہور، طبع اول، ۱۹۸۹ء، ص۱۴
(۱۶) محمد حیات خان سیال، گلاب کے پھول، (مجید امجد شخصیت فن اور منتخب کلام)، مکتبہ لائبریری، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص۱۲۰
(۱۷) محمد حیات خان سیال، گلاب کے پھول، مجید امجد شخصیت و فن اور منتخب کلام، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص۳۰
(۱۸) ناصر عباس نیرّ، مجید امجد شخصیت و فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۹۶